اس آیت میں عمارتِ مسجد کا منفی پہلو بیان کیا گیا تھا کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں۔

دوسری آیت میں عمارتِ مسجد کا مثبت پہلو اس طرح ارشاد فرمایا، اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ، "یعنی مسجدوں کو آباد کرنا انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لادیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور بجز اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں سو ایسے لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے"

مطلب یہ ہے کہ مساجد کی اصلی عمارت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے احکامِ الٰہی کے پابند ہوں، اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز زکوٰۃ کے پابند ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں، اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان کا ذکر کیا رسول پر ایمان کے ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ رسول پر ایمان لائے، اور اس کے ذریعہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں ان کو دل سے قبول کرے، اس لئے ایمان باللہ میں ایمان بالرسول فطری طور پر داخل ہے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام سے پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اس حدیث نے بتلا دیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے (مظہری بحوالہ صحیحین)

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے، ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل و فطرت ہے، درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے، فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى، اس لئے ایذاء اور نقصان پہونچانے والوں سے طبعی خوف نہ ہم قرآنی کے خلاف ہے، نہ رسالت اور ولایت کے ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا یہ مؤمن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

بعض مسائل متعلقہ آیت اور عمارتِ مسجد جس کے متعلق ان آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ مشرک کافر نہیں کر سکتے بلکہ وہ صرف نیک صالح مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے مراد مساجد کی تولیت اور انتظامی فرمہ داری

جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم بنانا جائز نہیں، باقی رہا ظاہری در و دیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں (تفسیر مراغی) اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنا دے یا مسجد بنانے کے لئے مسلمانوں کو چندہ دیدے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو (درّ المختار، شامی، مراغی)

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی، اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے، اور جو عبادت اور ذکر اللہ کے لئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کے لئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مؤمن کامل ہونے کی شہادت ہے۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابو سعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں۔

اور حضرت سلمان فارسیؓ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے (مظہری بحوالہ طبرانی، ابن جریر، بیہقی وغیرہ)

مفسر القرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی چیزوں سے پاک کرے جن کے لئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرید و فروخت دنیا کی باتیں، کسی گم شدہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا فضول قسم کے اشعار، جھگڑا، لڑائی اور شور و شغب وغیرہ (مظہری)

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ
کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا بسانا برابر اس کے جو
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ
یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر، اور لڑا اللہ کی راہ میں یہ برابر نہیں ہیں
عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
اللہ کے نزدیک اور اللہ رستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ، جو ایمان لائے

وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ
اور گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے ،
اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰
ان کیلئے بڑا درجہ ہے اللہ کے ہاں اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں ،
يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ
خوش خبری دیتا ہے انکو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں
فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ
ان کو آرام ہے ہمیشہ کا ، رہا کریں ان میں مدام ، بے شک اللہ کے پاس
اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ
بڑا ثواب ہے ، اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو
وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ
اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو ایمان سے ،
وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۳
اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گنہگار۔

خلاصۂ تفسیر

کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے عمل کی برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو (وہ عمل ایمان اور جہاد ہے، یعنی یہ عمل برابر نہیں اور جب اعمال برابر نہیں تو یہ (عامل) لوگ (بھی باہم) برابر نہیں اللہ کے نزدیک (غرض عمل عمل باہم اور عامل عامل باہم برابر نہیں مقصود بقرینہ سیاق یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر واحد افضل ہے، سقایہ اور عمارت کے ہر واحد سے یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور اس سے جواب ہو گیا مشرکین کا کہ ان میں ایمان نہ تھا، اور جہاد بھی دونوں سے افضل ہے اس سے جواب ہو گیا بعض مؤمنین کا جو کہ بعد ایمان کے سقایہ اور عمارت کو جہاد پر تفضیل دیتے تھے) اور (یہ امر مذکور بہت ہی ظاہر ہے لیکن) جو لوگ بے انصاف ہیں (مراد مشرک ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو

سمجھ نہیں دیتا (اس لئے وہ نہیں مانتے بخلاف اہل ایمان کے کہ وہ اس تحقیق کو فوراً مان گئے، آگے اس مضمون کی تصریح ہے جو اوپر لَا يَسْتَوٗنَ سے مقصود تھا یعنی) جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کیواسطے) انھوں نے ترک وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک (بمقابلہ اہل سقایہ و اہل عمارت کے) بہت بڑے ہیں (کیونکہ اگر اہل سقایہ و اہل عمارت میں ایمان نہ ہو تب تو یہ بڑائی انہی مؤمنین مہاجرین مجاہدین میں منحصر ہے اور اگر ان میں ایمان ہو تو گو وہ بھی بڑے ہیں مگر یہ زیادہ بڑے ہیں) اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں (کیونکہ اگر ان کے مقابلین میں ایمان نہ ہو تب تو کامیابی کا حصر انہی میں ہے، اور اگر ایمان ہو تو کامیابی مشترک ہے لیکن ان کی کامیابی ان سے اعلیٰ ہے، آگے اس درجہ اور فوز کا بیان ہے کہ) ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور (جنت کے) ایسے باغوں کی ان کے لئے کہ ان (باغوں) میں دائمی نعمت ہوگی (اور) ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے پاس بڑا اجر ہے، (اس میں سے ان کو دیا جائے گا) اے ایمان والو اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو (اپنا) رفیق مت بناؤ اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں (کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے) اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (مطلب یہ کہ بڑا مانع ہجرت سے ان لوگوں کا تعلق ہے اور خود وہی جائز نہیں پھر ہجرت میں کیا دشواری ہے)۔

معارف و مسائل

شروع کی چار آیتیں ۱۹ سے ۲۲ تک ایک خاص واقعہ سے متعلق ہیں، وہ یہ کہ بہت سے مشرکین مکہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم مسجد حرام کی آبادی اور حجاج کو پانی پلانے کا انتظام کرتے ہیں، اس سے بڑھکر کسی کا کوئی عمل نہیں ہو سکتا، اسلام لانے سے پہلے جب حضرت عباسؓ غزوۂ بدر میں گرفتار ہو کر مسلمانوں کی قید میں آئے، اور ان کے مسلم عزیزوں نے ان کو اس پر ملامت کی، کہ آپ نعمت ایمان سے محروم ہیں تو انھوں نے بھی یہی کہا تھا کہ آپ لوگ ایمان و ہجرت کو اپنا بڑا سرمایۂ فضیلت سمجھتے ہیں، مگر ہم بھی تو مسجد حرام کی عمارت اور حجاج کو پانی پلانے کی اہم خدمات کے متولی ہیں جن کی برابر کسی کا عمل نہیں ہو سکتا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، (ابن کثیر بروایت علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس)

اور مسند عبدالرزاق کی بعض روایات میں ہے کہ حضرت عباسؓ کے مسلمان ہو جانے کے بعد طلحہ بن شیبہؓ اور حضرت عباسؓ اور علی کرم اللہ وجہہٗ کے آپس میں گفتگو ہو رہی تھی، طلحہ نے کہا کہ مجھے وہ فضیلت حاصل ہے جو تم میں سے کسی کو حاصل نہیں، کہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ

میں ہوں اگر چاہو تو بیت اللہ کے اندر جا کر رات گذار سکتا ہوں، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میں حجاج کو پانی پلانے کا متولی اور منتظم ہوں، اور مسجد حرام میں میرے اختیارات ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ حضرات کس چیز پر فخر کر رہے ہیں، میرا حال تو یہ ہے کہ میں نے سب لوگوں سے چھ مہینہ پہلے بیت اللہ کی طرف نمازیں پڑھی ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہوں، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں واضح کر دیا گیا کہ کوئی عمل کتنا ہی اعلیٰ و افضل ہو ایمان کے بغیر اللہ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں، اور نہ حالتِ شرک میں ایسے اعمال کا کرنے والا اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجد نبویؐ میں چند حضرات صحابہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کے پاس جمع تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام و ایمان کے بعد میرے نزدیک حجاج کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں، اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پروا نہیں، ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں، اللہ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے، ان دونوں میں بحث ہونے لگی، تو حضرت فاروق اعظمؓ نے دونوں کو ڈانٹ کر کہا کہ منبر نبویؐ کے پاس شور و شغب نہ کرو، مناسب بات یہ ہے کہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے بعد یہ بات خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لو، اس تجویز کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، جن میں جہاد کو عمارتِ مسجد حرام اور سقایۃ حجاج سے افضل عمل بتلایا گیا۔

اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ اصل آیات کا نزول تو مشرکین کے فخر و تکبر کے جواب میں ہوا ہو، پھر اس کے بعد جو واقعات مسلمانوں کے باہم پیش آئے ان میں بھی انہی آیات کو استدلال کے لئے پیش کیا گیا ہو جس سے سننے والوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ آیات اس واقعہ میں نازل ہوئیں۔

بہرحال آیات مذکورہ میں دونوں قسم کے واقعات کا یہ جواب ہے کہ شرک کے ساتھ تو کوئی عمل کتنا ہی بڑا ہو مقبول اور قابلِ ذکر ہی نہیں، اس لئے کسی مشرک کو عمارتِ مسجد، یا سقایۃ حجاج کی وجہ سے کوئی فضیلت و بزرگی مسلمانوں کے مقابلہ میں حاصل نہیں ہو سکتی، اور ایمان کے بعد بھی ایمان و جہاد کا درجہ بہ نسبت عمارتِ مسجدِ حرام اور سقایۃ الحجاج کے بہت زیادہ ہے جو مسلمان ایمان و جہاد میں مقدم رہے وہ ان مسلمانوں سے افضل ہیں جنھوں نے جہاد میں شرکت نہیں کی، صرف مسجد حرام کی تعمیر اور حجاج کے پانی پلانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس تمہید کے بعد آیات مذکورہ کے الفاظ اور ترجمہ پر پھر ایک نظر ڈالئے، ارشاد فرمایا

کہ کیا تم نے حجاج کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص کے برابر قرار دیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو، یہ لوگ برابر نہیں اللہ کے نزدیک۔

بقرینۂ سیاق مقصود یہ ہے کہ ایمان اور جہاد میں سے ہر ایک افضل ہے، سقایۃ الحجاج اور عمارتِ مسجد سے، یعنی ایمان بھی دونوں سے افضل ہے، اور جہاد بھی، ایمان کے افضل ہونے سے مشرکین کی بات کا جواب ہو گیا، اور جہاد کے افضل ہونے سے ان مسلمانوں کی بات کا جواب ہو گیا جو عمارتِ مسجد اور سقایۃ حجاج کو جہاد سے افضل کہتے تھے۔

ذکر اللہ جہاد سے افضل ہے

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں جو عمارتِ مسجد پر جہاد کو فضیلت اور ترجیح دی گئی ہے یہ عمارت کے ظاہری معنی کی رُو سے ہے یعنی مسجد کی تعمیر اور ضروری انتظامات کہ جہاد کا ان کے مقابلہ میں افضل ہونا مسلّم ہے۔

لیکن عمارتِ مسجد کے ایک دوسرے معنی عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مسجد میں حاضری کے بھی آتے ہیں، اور درحقیقت مسجد کی اصلی عمارت و آبادی اسی سے ہے، اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات کی بناء پر عمارتِ مسجد جہاد سے افضل و اعلیٰ ہے جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی، ابن ماجہ میں حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتلاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو، اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو، اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کر دو وہ تمہیں قتل کریں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ عمل ضرور بتلائیے، آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے، اور عمارتِ مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے، مگر اس جگہ مشرکین کا فخر و غرور ظاہر ہے کہ ذکر اللہ اور عبادت کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا، اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا۔

اور قرآن و سنت کے مجموعی ارشادات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا دوسرے عمل سے افضل و اعلیٰ ہونا حالات و واقعات کے تابع ہوتا ہے، بعض حالات میں ایک عمل دوسرے سے افضل ہوتا ہے، اور حالات بدلنے کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے، جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اُس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہوگا، جیسا کہ غزوۂ خندق میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار نمازیں قضا ہو جانے

کے واقعہ سے ظاہر ہے، اور جس وقت ایسی شدید ضرورت نہ ہو تو ذکر اللہ اور عبادت بمقابلہ جہاد کے افضل ہوگا۔

آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فرما کر یہ بتلا دیا کہ یہ کوئی دقیق اور باریک بات نہیں بلکہ بالکل واضح ہے کہ ایمان سارے اعمال کی بنیاد اور ان سب سے افضل ہے، اور یہ کہ جہاد بہ نسبت عمارتِ مسجد اور سقایۃ الحجاج کے افضل ہے، مگر اللہ تعالیٰ بے انصاف لوگوں کو سمجھ نہیں دیتا، اس لئے وہ ایسی کھلی اور ظاہری باتوں میں بھی کج بحثی کرتے رہتے ہیں۔

بیسویں آیت میں اس مضمون کی تفصیل ہے جو پہلی آیت میں لَا يَسْتَوٗنَ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے، یعنی ایمان لانے والے مجاہد اور صرف عمارتِ مسجد اور سقایۃ حجاج کرنے والے اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں، اس میں ارشاد فرمایا، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ، یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے نزدیک درجہ میں بڑے ہیں، اور پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

کیونکہ ان کے مقابلہ میں جو مشرک ہیں ان کو تو کامیابی کا کوئی درجہ ہی حاصل نہیں، اور جو مسلمان ہیں اگرچہ نفس کامیابی میں وہ بھی شریک ہیں، مگر ان کی کامیابی ان سے بڑھی ہوئی ہے، اس لئے پورے کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اکیسویں اور بائیسویں آیتوں میں ان کامیاب لوگوں کے اجر عظیم اور درجاتِ آخرت کا بیان ہے يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۧ یعنی ان لوگوں کو ان کا پروردگار خوش خبری سناتا ہے اپنی رحمت اور رضا کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ان کے لئے ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں ہونگی اور یہ لوگ بھی ان نعمتوں میں ہمیشہ رہیں گے، ان کو یہاں سے کبھی نہ نکالا جائے گا، بیشک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔

آیاتِ مذکورہ میں ہجرت اور جہاد کے فضائل کا بیان آیا ہے، جن میں وطن اور اعزاء و اقارب اور احباب و اصحاب اور اموال و املاک سب کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت پر یہ کام سب سے زیادہ شاق اور دشوار ہیں، اس لئے اگلی آیت میں ان چیزوں کے ساتھ حد سے زیادہ تعلق اور محبت کی مذمت فرما کر مسلمانوں کے ذہنوں کو ہجرت و جہاد کے لئے آمادہ کیا گیا ہے، ارشاد فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

یعنی اے ایمان والو تم اپنے باپ دادا اور بھائیوں کو رفیق مت بناؤ، اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے عزیز رکھیں، اور تم میں سے جو شخص ان کے ساتھ باوجود ان کے کفر کے رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں۔

ماں باپ بھائی بہن اور تمام رشتہ داروں سے تعلق کو مضبوط رکھنے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایات سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے، مگر اس آیت میں یہ بتلا دیا کہ ہر تعلق کی ایک حد ہے، ان میں سے ہر تعلق خواہ ماں باپ اور اولاد کا ہو، یا حقیقی بھائی بہن کا، اللہ اور اس کے رسول کے تعلق کے ..... مقابلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل ہے، جس موقع پر یہ دونوں رشتے ٹکرا جائیں، تو پھر رشتہ و تعلق اللہ و رسول کا ہی قائم رکھنا ہے، اس کے مقابلہ میں سارے تعلقات سے قطع نظر کرنا ہے۔

آیات مذکورہ کے متعلق چند فوائد اور مسائل

مذکورہ پانچ آیتوں سے چند فوائد اور مسائل حاصل ہوئے،

اوّل یہ کہ ایمان روحِ عمل ہے، اس کے بغیر کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ صرف صورت بے جان اور ناقابلِ قبول ہے، حجابِ آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہیں، ہاں اللہ تعالیٰ کے یہاں بے انصافی نہیں، کافروں کے ایسے بے روح اعمالِ حسنہ بھی بالکل ضائع نہیں کئے جاتے، ان کا بدلہ ان کو دنیا ہی میں آرام و عیش اور دولت و راحت دے کر بیباق کر دیا جاتا ہے، جس کا بیان قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

دوسرا فائدہ ان آیات سے یہ حاصل ہوا کہ معصیت و نافرمانی سے انسان کی عقل بھی خراب ہو جاتی ہے اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، اُنیسویں آیت کے آخر میں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ، فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ اس کے بالمقابل ایک آیت میں اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ اطاعت و تقویٰ سے انسان کی عقل کو جلا ہوتی ہے، سلامتِ فکر نصیب ہوتی ہے، وہ اچھے برے کی تمیز میں غلطی نہیں کرتا۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ نیک اعمال میں بھی باہمی تفاضل ہے اور اسی کی مناسبت سے عمل کرنے والوں کے درجات میں تفاضل قائم ہوتا ہے، سب عمل کرنے والے ایک درجہ میں نہیں رکھے جا سکتے، اور مدار کثرتِ عمل پر نہیں بلکہ حسنِ عمل پر ہے، سورۂ ملک میں آیا ہے: لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کریں گے، کہ کون زیادہ اچھا عمل کرنیوالا ہے۔

چوتھا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ راحت و نعمت کے دائمی رہنے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ وہ نعمتیں کسی وقت ختم نہ ہو جائیں، دوسرے یہ کہ کسی وقت ان لوگوں کو ان نعمتوں سے جدا نہ کیا جائے، اس لئے اللہ کے مقبول بندوں کے لئے دونوں چیزوں کی ضمانت دیدی گئی، نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ فرما کر نعمتوں کا دائمی ہونا بیان فرما دیا، اور خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، فرما کر ان لوگوں کو کبھی ان نعمتوں

سے الگ نہ کرنے کا اطمینان دلایا۔

وصل رشتہ اسلام و ایمان کا رشتہ ہے، نسبی وطنی تعلقات سب اس پر قربان کرنے ہیں

پانچواں مسئلہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مقدم ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے، صحابہ کرام کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان و مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کرکے زبانِ حال سے کہا ؎

تو نخلِ خوش ثمر کیستی کہ سرو و سمن ٭ ہمہ ز خویش برید ند و با تو پیوستند

بلال حبشی، صہیب رومی، سلمان فارسی اور قریشِ مکہ انصارِ مدینہ تو سب آپس میں بھائی بھائی ہوگئے، اور بدر و اُحد کے میدانوں میں باپ بیٹے، بھائی بھائی کی تلواریں آپس میں ٹکرا کر اسکی شہادت دی کہ ان کا مسلک یہ تھا کہ ؎

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد ٭ فدائے یک تنِ بیگانہ کآشنا باشد

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا اتِّبَاعَھُمْ وَاجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیْنَا وَخَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدَنَا

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں

وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ

اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے

کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول

وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا یَھْدِی

سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم، اور اللہ رستہ نہیں دیتا ع ۳/۹

الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾

نافرمان لوگوں کو۔

خلاصۂ تفسیر

(آگے اسی مضمون کی زیادہ تفصیل ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (ان سے)

کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں (رہنے) کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (سزائے ترکِ ہجرت کا) بھیج دیں (جیسا دوسری آیت میں ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ الیٰ قولہ فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ) اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا (یعنی ان کا مقصود تھا ان چیزوں سے تمتع وہ بہت جلد خلاف اُن کی توقع کے موت سے منقطع ہو جاتا ہے)۔

معارف و مسائل

سورۂ توبہ کی یہ آیت دراصل ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے مکہ سے ہجرت فرض ہونے کے وقت ہجرت نہیں کی، ماں باپ، بھائی، بہن، اولاد اور بیوی اور مال و جائداد کی محبت نے ان کو فریضۂ ہجرت ادا کرنے سے روک دیا، ان کے بارے میں حق تعالیٰ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ اُن لوگوں سے کہہ دیں کہ:

"اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیبیاں اور تمھارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں، اور اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتا"

اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجدیں امام تفسیر مجاہدؒ نے فرمایا کہ حکم سے مراد جہاد و قتال اور فتح مکہ کا حکم ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اس وقت دنیاوی تعلقات پر اللہ و رسول کے تعلقات کے قربان کرنے والوں کا انجام بد عنقریب سامنے آنے والا ہے، جبکہ مکہ فتح ہوگا، اور نافرمانی کرنے والے ذلیل و خوار ہوں گے، اور ان کے یہ تعلقات اس وقت ان کے کام نہ آئیں گے۔

اور حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ اس جگہ حکم سے مراد حکمِ عذاب ہے کہ دنیوی تعلقات پر اُخروی تعلقات کو قربان کرکے ہجرت نہ کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کا حکمِ عذاب عنقریب آنے والا ہے یا تو دنیا ہی میں اُن پر عذاب آئے گا ورنہ آخرت کا عذاب تو یقینی ہے، آیت میں اس جگہ مقصود تو ترکِ ہجرت پر وعید ہے، مگر ذکر بجائے ہجرت کے جہاد کا کیا گیا، جو ہجرت کے بعد کا اگلا قدم ہے، اس میں اشارہ

کر دیا گیا کہ ابھی تو صرف ہجرت اور ترکِ وطن ہی کا حکم ہوا ہے، اس میں کچھ لوگ ہمت ہار بیٹھے، آگے جہاد کا حکم آنے والا ہے، جس میں اللہ اور رسولؐ کی محبت پر ساری محبتوں کو اور خود اپنی جان کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ ہجرت ہی کو جہاد سے تعبیر کر دیا ہو کیونکہ وہ بھی حقیقت میں جہاد ہی کا ایک شعبہ ہے۔

اور آخر آیت میں وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ فرما کر یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ حکم ہجرت کے باوجود اپنے دنیوی تعلقات کو ترجیح دے کر اپنے خویش و عزیز اور مال و مکان سے چمٹے رہے، ان کا یہ عمل دنیا میں بھی اُن کے لئے مفید نہیں ہوگا، اور اُن کا یہ مقصد حاصل نہیں ہوگا کہ ہمیشہ اپنے اہل و عیال اور مال و مکان میں امن و چین سے بیٹھے رہیں، بلکہ حکم جہاد شروع ہوتے ہی یہ سب چیزیں اُن کے لئے وبالِ جان بن جائیں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نافرمانی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہونچاتے۔

مسائل متعلقہ ہجرت

اوّل، جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض کر دی گئی تو وہ صرف ایک فرض ہی نہیں بلکہ مسلمان ہونے کی علامت بھی تھی، جو باوجود قدرت کے ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا، یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگیا، اور اصل حکم یہ باقی رہ گیا کہ جس زمین پر انسان کو اللہ کے احکام نماز روزہ وغیرہ کی تعمیل ممکن نہ ہو اس سے ہجرت کرنا ہمیشہ کے لئے فرض ہے، بشرطیکہ ہجرت پر قدرت ہو۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر ایسی جگہ کو چھوڑ دے جہاں فسق و فجور کا غلبہ ہو یہ ہمیشہ کیلئے مستحب ہے (تفصیل فتح الباری میں ہے)

آیت مذکورہ میں براہ راست تو خطاب ان لوگوں سے ہے جنھوں نے ہجرت فرض ہونے کے وقت دنیوی تعلقات کی محبت سے مغلوب ہو کر ہجرت نہیں کی، لیکن الفاظ آیت کا عموم تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجہ ہونا لازم و واجب ہے کہ دوسرا کوئی تعلق اور کوئی محبت اُس پر غالب نہ آئے، اور جس نے اس درجے کی محبت پیدا نہ کی وہ مستحق عذاب ہوگیا، اس کو عذاب الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

سچا ایمان اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ اللہ اور رسولؐ کی محبت ساری دنیا اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ ہو!!

اسی لئے ایک صحیح حدیث میں جو صحیحین میں بروایت انسؓ منقول ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

اور ابوداؤد و ترمذی میں بروایت ابوامامہؓ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا کہ جس نے کسی سے دوستی کی تو اللہ کے لئے کی اور دشمنی کی تو وہ بھی اللہ کے لئے کی اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رُکا تو وہ بھی اللہ کے لئے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

ان روایاتِ حدیث سے بھی ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس پر موقوف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو، اور انسان کی دوستی دشمنی، دینا یا نہ دینا سب حکم خدا و رسولؐ کے تابع ہو۔

امام تفسیر قاضی بیضاوی وغیرہ نے فرمایا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اس آیت کی وعید سے مستثنیٰ ہوں، کیونکہ عام طور پر بڑے سے بڑے عابد و زاہد اور عالم و متقی بھی اہل و عیال اور مال و متاع کی محبت سے مغلوب نظر آتے ہیں، اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ، مگر ساتھ ہی قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے، غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت و اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، اس لئے اگر کسی شخص کا دل ان دنیوی تعلقات کی طبعی محبت سے لبریز ہو مگر ان سے اتنا مغلوب نہ ہو کہ اللہ و رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی کی پروا نہ کرے، تو وہ بھی اس وعید سے خارج اور اللہ و رسولؐ کی محبت کو غالب رکھنے والا ہے، جیسے کوئی بیمار دوا کی تلخی یا آپریشن کی تکلیف سے طبعاً گھبراتا ہے، مگر عقلاً اس کو اپنی نجات و سلامتی کا ذریعہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے، تو وہ کسی کے نزدیک قابلِ ملامت نہیں، اور نہ کوئی عقلِ سلیم اس کو اس پر مجبور کرتی ہے، کہ طبعی اور غیر اختیاری گھبراہٹ اور کراہت کو بھی دل سے نکال دے، اسی طرح اگر کسی کو مال و اولاد وغیرہ کی محبت کے سبب بعض احکام الٰہیہ کی تعمیل میں غیر اختیاری طور پر تکلیف محسوس ہو، مگر اس کے باوجود وہ اس تکلیف کو برداشت کر کے احکام الٰہیہ بجا لائے تو وہ بھی قابلِ ملامت نہیں، بلکہ قابلِ تحسین ہے اور اللہ و رسولؐ کی محبت کو اس آیت کے مطابق غالب رکھنے والا کہلائے گا۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ محبت کا اعلےٰ مقام یہی ہے کہ محبت طبیعت پر بھی غالب آجائے، اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذت ہر تلخی و تکلیف کو بھی لذیذ بنا دے، جیسا دنیا کی فانی لذت و راحت کے طلبگاروں کو رات دن دیکھا جاتا ہے، کہ بڑی سے بڑی محنت و مشقت کو ہنس کھیل کر اختیار کر لیتے ہیں، کسی دفتر کی ملازمت میں مہینہ کے ختم پر ملنے والے چند سکوں کی محبت انسان کی نیند، آرام اور سارے تعلقات پر ایسی غالب آجاتی ہے کہ اس کے پیچھے ہزاروں مشقتوں کو بڑی کوششوں، سفارشوں، اور رشوتوں کے ذریعہ حاصل کرتا ہے ؎

رنج و راحت شد چو مطلب شد بزرگ ٭ گردِ گلہ توتیائے چشم گرگ

اللہ والوں کو یہ مقام اللہ و رسول اور نعمائے آخرت کی محبت میں ایسا ہی حاصل ہوتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تکلیف تکلیف نظر نہیں آتی، صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جاویں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے، وہ تین خصلتیں یہ ہیں، ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لئے محبت رکھے، تیسرے یہ کہ کفر و شرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو۔

اس حدیث میں حلاوتِ ایمان سے مراد محبت کا یہی مقام ہے جو انسان کے لئے ہر مشقت و محنت کو لذیذ بنا دیتا ہے ؎ از محبت تلخہا شیریں شود، اسی مقام کے متعلق بعض علماء نے فرمایا ہے ؎

وَاِذَا حَلَتِ الْحَلَاوَةُ قَلْبًا ۔ نَشَطَتْ فِی الْعِبَادَةِ الْاَعْضَاءُ

یعنی جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جاتی ہے، تو عبادت و اطاعت میں اس کے اعضاء لذت پانے لگتے ہیں۔

اسی کو بعض روایات میں بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ محبت خدا و رسول کا یہ مقام ایک نعمتِ کبریٰ ہے، مگر وہ صرف اللہ والوں کی صحبت و معیت ہی سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے صوفیائے کرام اس کو خدمتِ مشائخ سے حاصل کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، صاحب روح البیان نے فرمایا کہ یہ مقامِ محبت اسی کو حاصل ہوتا ہے جو خلیل اللہ کی طرح اپنے مال، اولاد اور جان کو اللہ کی محبت میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو ؎

خلیل آسا دریں ملک یقین زن ۔ تو اے لا احب الآفلین زن

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و شریعت کی حفاظت اور اس میں رخنے ڈالنے والوں کی مدافعت بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ایک کھلا نشان ہے، رزقنا اللہ تعالیٰ وجمیع المسلمین محبۃ و حب رسولہ کما یحب و یرضاہ

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ

مدد کر چکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن، جب

اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ

خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہو گئی تم پر

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ

زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر، پھر اتاری اللہ نے

سَكِیْنَتَهٗ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ

اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اتاریں فوجیں کہ جن کو

تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶﴾

تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے منکروں کی

ثُمَّ یَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۷﴾

پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جسکو چاہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

خلاصۂ تفسیر

تم کو خدا تعالیٰ نے (لڑائی کے) بہت موقعوں میں (کفار پر) غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ) اور حنین کے دن بھی (جس کا قصہ عجیب و غریب ہے تم کو غلبہ دیا) جبکہ (یہ واقعہ ہوا تھا کہ) تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور (کفار کے تیر برسانے سے ایسی پریشانی ہوئی کہ) تم پر زمین باوجود اپنی (اس) فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (کے قلب) پر اور دوسرے مؤمنین (کے قلوب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی، اور (مدد کے لئے) ایسے لشکر (آسمان سے) نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا (مراد فرشتے ہیں جس کے بعد تم پھر مستعد قتال ہوئے اور غالب آئے) اور (اللہ تعالیٰ نے) کافروں کو سزا دی (کہ ان پر ہزیمت اور قتل و قید واقع ہوئی) اور یہ کافروں کی (دنیا میں) سزا ہے، پھر اللہ تعالیٰ (ان کافروں میں سے) جسکو چاہیں توبہ نصیب کر دیں (چنانچہ بہت سے مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنیوالے ہیں، (کہ جو شخص ان میں مسلمان ہوا اس کے سب پچھلے گناہ معاف کر کے مستحق جنت کا بنا دیا)۔

معارف و مسائل

آیاتِ مذکورہ میں غزوۂ حنین کے واقعات شکست و فتح کا اور ان کے ضمن میں بہت سے اصولی اور فروعی مسائل اور فوائد کا بیان ہے، جیسا کہ اس سے پہلی سورت میں فتح مکہ اور اس کے متعلقات کا ذکر تھا، شروع آیت میں حق تعالیٰ نے اپنے اس انعام و احسان کا ذکر فرمایا ہے،

جو مسلمانوں پر ہر موقع اور ہر حالت میں مبذول رہا ہے، ارشاد فرمایا،

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد فرمائی بہت سے مقامات میں، اور اس تمہید کے بعد خصوصیت کے ساتھ فرمایا وَيَوْمَ حُنَيْنٍ "یعنی غزوۂ حنین کے دن بھی اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچی"

غزوۂ حنین کی خصوصیت اس وجہ سے فرمائی ہے کہ اس میں بہت سے واقعات اور حالات خلافِ توقع عجیب انداز سے ظاہر ہوئے، جن میں غور کرنے سے انسان کے ایمان میں قوت اور عمل میں ہمت پیدا ہوتی ہے، اس لئے آیاتِ مذکورہ کی لفظی تفسیر سے پہلے اس غزوہ کے ضروری واقعات جو حدیث و تاریخ کی مستند کتابوں میں مذکور ہیں کسی قدر تفصیل سے بیان کر دینا مناسب ہے تاکہ آیات مذکورہ کے سمجھنے میں آسانی ہو اور جن فوائد کے لئے یہ واقعات بیان فرمائے گئے ہیں وہ سامنے آجائیں، ان واقعات کا بیشتر حصہ تفسیر مظہری سے لیا گیا ہے، جس میں بحوالہ کتبِ حدیث و تاریخ واقعات کا ذکر ہے۔

حُنین، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، جو مکہ مکرمہ سے دس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ پر واقع ہے، رمضان ۸ھ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور قریش مکہ نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، تو عرب کا ایک بہت بڑا مشہور بہادر جنگجو اور مالدار قبیلہ ہوازن جس کی ایک شاخ طائف کے رہنے والے بنو ثقیف بھی تھے، ان میں ہلچل مچ گئی، انھوں نے جمع ہو کر یہ کہنا شروع کیا کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد مسلمانوں کو کافی قوت حاصل ہو گئی ہے، اس سے فارغ ہونے کے بعد لازمی ہے کہ ان کا رُخ ہماری طرف ہوگا، اس لئے دانشمندی کی بات یہ ہے کہ ان کے حملہ آور ہونے سے پہلے ہم خود ان پر حملہ کر دیں، اس کام کے لئے قبیلہ ہوازن نے اپنی سب شاخوں کو جو مکہ سے طائف تک پھیلی ہوئی تھیں جمع کر لیا، اس قبیلہ کے سب بڑے چھوٹے بجز معدودے چند افراد کے جن کی تعداد سو سے بھی کم تھی، سب ہی جمع ہو گئے۔

اس تحریک کے لیڈر مالک بن عوف تھے، جو بعد میں مسلمان ہو گئے، اور اسلام کے بڑے علمبردار ثابت ہوئے، اس وقت مسلمانوں کے خلاف حملہ کا سب سے زیادہ جوش انہی میں تھا، قبیلہ کی عظیم اکثریت نے ان کی رائے سے اتفاق کر کے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، اس قبیلہ کی چھوٹی چھوٹی دو شاخیں بنو کعب اور بنو کلاب اس رائے سے متفق نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ بصیرت دیدی تھی، انھوں نے کہا کہ اگر مشرق سے مغرب تک ساری دنیا بھی محمدؐ کے خلاف جمع ہو جائے گی تو وہ ان سب پر بھی غالب آئیں گے، ہم خدائی طاقت کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتے، باقی سب کے سب نے معاہدے کئے، اور مالک ابن عوف نے ان سب کو پوری

قوت سے جنگ پر قائم رہنے کی ایک تدبیر یہ کی کہ ہر شخص کے تمام اہل و عیال بھی ساتھ چلیں، اور اپنا اپنا پورا مال بھی ساتھ لے کر نکلیں، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میدان سے بھاگنے لگیں تو بیوی بچوں اور مال کی محبت ان کے پاؤں کی زنجیر بن جائے، میدان سے گریز کا ان کے لئے کوئی موقع نہ رہے، ان کی تعداد کے بارے میں اہل تاریخ کے مختلف اقوال ہیں، حافظ حدیث علامہ ابن حجر وغیرہ نے راجح اس کو قرار دیا ہے کہ چوبیس یا اٹھائیس ہزار کا مجمع تھا، اور بعض حضرات نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے، یہ ممکن ہے کہ سب اہل و عیال عورتوں بچوں سمیت تعداد چوبیس یا اٹھائیس ہزار ہو، اور لڑنے والے جوان ان میں چار ہزار ہوں۔

بہرحال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ میں ان کے خطرناک عزائم کی اطلاع ملی تو آپ نے ان کے مقابلہ پر جانے کا عزم فرما لیا، مکہ مکرمہ پر حضرت عتابؓ بن اسید کو امیر بنایا، اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو ان کے ساتھ لوگوں کو اسلامی تعلیمات سکھانے کے لئے چھوڑا، اور قریشِ مکہ سے اسلحہ اور سامانِ جنگ عاریت کے طور پر مانگا، صفوان بن امیہ جو قریش کا سردار تھا بول اٹھا کہ کیا آپ یہ سامانِ جنگ ہم سے غصب کر کے لینا چاہتے ہیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں بلکہ عاریت کے طور پر لیتے ہیں جس کی واپسی ہمارے ذمہ ہوگی، یہ سن کر اس نے سو زرہیں مستعار دیں اور نوفل بن حارث نے تین ہزار نیزے اسی طرح پیش کر دیئے امام زہریؒ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چودہ ہزار صحابہ کا لشکر لے کر اس جہاد کی طرف متوجہ ہوئے، جن میں بارہ ہزار انصار مدینہ تھے، جو فتح مکہ کے لئے آپ کے ساتھ آئے تھے، اور دو ہزار وہ مسلمان تھے جو مکہ اور اطراف مکہ کے لوگوں میں سے بوقت فتح مسلمان ہو گئے تھے، جن کو طلقاء کہا جاتا ہے، شوال کی چھٹی تاریخ ہفتہ کے دن آپ اس غزوہ کے لئے نکلے، اور فرمایا کہ کل انشاء اللہ تمہارا قیام خیف بنی کنانہ کے اس مقام پر ہوگا، جہاں جمع ہو کر قریشِ مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کے لئے عہدنامہ لکھا تھا۔

یہ چودہ ہزار مجاہدین کا لشکر تو جہاد کے لئے نکلا، ان کے ساتھ مکہ کے بیشمار لوگ مرد و عورت تماشائی بنکر نکلے، جن کے دلوں میں عموماً یہ تھا کہ اگر اس موقع پر مسلمانوں کو شکست ہو تو ہمیں بھی اپنا انتقام لینے کا موقع ملے گا، اور یہ کامیاب ہوں تو بھی ہمارا کوئی نقصان نہیں۔

اسی قسم کے لوگوں میں ایک شیبہ بن عثمان بھی تھے، جنھوں نے بعد میں مسلمان ہو کر خود اپنا واقعہ بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میرا باپ حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے اور چچا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا جس کا جوشِ انتقام اور انتہائی غیظ میرے دل میں تھا، میں اس موقع کو غنیمت جان کر مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا کہ جب کہیں موقع پاؤں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر

حملہ کردوں، میں ان کے ساتھ ہو کر ہر وقت موقع کی تلاش میں رہا، یہاں تک کہ اس جہاد کے ابتدائی وقت میں جب کچھ مسلمانوں کے پاؤں اکھڑے اور وہ بھاگنے لگے تو میں موقع پا کر حضورؐ کے قریب پہونچا، مگر دیکھا کہ داہنی طرف حضرت عباسؓ آپؐ کی حفاظت کر رہے ہیں، اور بائیں طرف ابوسفیان ابن حارث، اس لئے میں پیچھے کی طرف پہونچ کر ارادہ ہی کر رہا تھا کہ یکبارگی تلوار سے آپؐ پر حملہ کردوں کہ یکایک آپؐ کی نظر مجھ پر پڑی، اور آپؐ نے مجھے آواز دی کہ شیبہ یہاں آؤ، اپنے قریب بلا کر دستِ مبارک میرے سینہ پر رکھ دیا، اور دعا کی کہ یا اللہ اس سے شیطان کو دور کردے، اب جو میں نظر اٹھاتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے دل میں اپنے آنکھ، کان اور جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ کفار کا مقابلہ کرو، اب تو میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جان آپ پر قربان کر رہا تھا، اور بڑی بے جگری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس جہاد سے واپس گئے تو میں خدمت میں حاضر ہوا، آپؐ نے میرے دل کے تمام خیالات کی نشاندہی کر دی کہ تم مکہ سے اس نیت پر چلے تھے، اور میرے گرد میرے قتل کے لئے گھوم رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ تم سے نیک کام لینے کا تھا جو ہو کر رہا۔

اس طرح کا واقعہ نضر بن حارث کو پیش آیا کہ وہ بھی اسی نیت سے حنین گئے تھے، دل پہونچ کر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت اور محبت ڈال دی، اور ایک مرد مجاہد بن کر دشمنوں کی صفوں سے ٹکرا گئے۔

اسی سفر میں ابو بردہ بن نیارؓ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ مقام اوطاس پہنچ کر دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے ہیں، اور ایک اور شخص آپ کے پاس بیٹھا کر آپؐ نے ذکر فرمایا کہ میں سو گیا تھا، یہ شخص آیا اور..... میری تلوار اپنے قبضہ میں لے کر میرے سر پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے محمدؐ! اب بتلاؤ تمہیں کون میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے! میں نے جواب دیا کہ اللہ بچا سکتا ہے، یہ سن کر تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی، ابو بردہ نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں اس دشمنِ خدا کی گردن ماردوں، یہ دشمن قوم کا جاسوس معلوم ہوتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابو بردہ خاموش رہو اللہ تعالیٰ میری حفاظت کرنے والا ہے جب تک کہ میرا دین سارے دینوں پر غالب نہ آجائے، اور آپؐ نے اس شخص کو کوئی ملامت بھی نہ فرمائی، اور آزاد چھوڑ دیا۔

مقام حنین پر پہونچ کر مسلمانوں نے پڑاؤ ڈالا تو حضرت سہیل بن حنظلہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ خبر لے کر حاضر ہوئے کہ گھوڑے سوار آدمی ابھی دشمن کی طرف سے آیا ہے وہ بتلا رہا ہے کہ قبیلۂ ہوازن پورا کا پورا مع اپنے سب سامان کے مقابلہ پر آگیا ہے، آنحضرتؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنکر تبسم فرمایا اور کہا کہ پروا نہ کرو یہ سارا سامان مسلمانوں کے لئے مالِ غنیمت بن کر ہاتھ آئے گا۔

اس جگہ ٹھہر کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن حدادؓ کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ دشمن کے حالات کا پتہ چلائیں، وہ ان کی قوم میں جا کر دو دن رہے، سب حالات دیکھتے سنتے رہے، ان کے لیڈر اور کمانڈر مالک بن عوف کو دیکھا کہ وہ اپنے لوگوں سے کہہ رہا ہے کہ محمدؐ کو ابتک کسی بہادر تجربہ کار قوم سے سابقہ نہیں پڑا، مکہ کے بھولے بھالے قریشیوں کا مقابلہ کر کے انھیں اپنی طاقت کا زعم ہو گیا، اب ان کو پتہ لگے گا، تم سب لوگ صبح ہوتے ہی اس طرح صف بندی کرو کہ ہر ایک کے پیچھے اس کے بیوی بچے اور مال ہو، اور اپنی تلواروں کی میانوں کو توڑ ڈالو، اور سب مل کر یکبارگی ہلہ بولو، یہ لوگ جنگ کے بڑے تجربہ کار تھے، اپنی فوج کے چند دستوں کو مختلف گھاٹیوں میں چھپا دیا تھا۔

اس طرف کفار کے لشکر کی یہ تیاریاں تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کا یہ پہلا جہاد تھا۔ جس میں چودہ ہزار سپاہی مقابلہ کے لئے نکلے تھے، اور سامانِ جنگ بھی ہمیشہ سے زیادہ تھا، اور یہ لوگ بدر و اُحد کے میدانوں میں یہ دیکھ چکے تھے کہ صرف تین سو تیرہ بے سامان لوگوں نے ایک ہزار کے لشکرِ جرار پر فتح پائی، تو آج اپنی کثرت اور تیاری پر نظر کر کے حاکم اور بزار کی روایت کے مطابق ان میں سے بعض کی زبان سے ایسے کلمات نکل گئے کہ آج تو یہ ممکن نہیں کہ ہم کسی سے مغلوب ہو جائیں آج تو مقابلہ کی دیر ہے کہ دشمن فوراً بھاگے گا۔

مالک الملک والملکوت کو یہی چیز ناپسند تھی کہ اپنی طاقت پر کوئی بھروسہ کیا جائے، چنانچہ مسلمانوں کو اس کا سبق اس طرح ملا کہ جب قبیلۂ ہوازن نے قرارداد کے مطابق یکبارگی ہلہ بولا اور گھاٹیوں میں چھپے ہوئے دستوں نے چار طرف سے گھیرا ڈال دیا، گرد و غبار نے دن کو رات بنا دیا تو صحابۂ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے اور بھاگنے لگے، صرف رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے تھے، اور بہت تھوڑے سے صحابۂ کرام جن کی تعداد تیس سو اور بعض نے ایک سو یا اس سے بھی کم بتلائی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہے، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ آپؐ آگے نہ بڑھیں۔

یہ حالت دیکھ کر آپؐ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ بلند آواز سے صحابہ کو پکارو کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنھوں نے شجرہ کے نیچے جہاد کی بیعت کی تھی، اور سورۂ بقرہ والے حضرات کہاں ہیں، اور وہ انصار کہاں ہیں جنھوں نے جان کی بازی لگانے کا عہد کیا تھا، سب کو چاہئے کہ واپس آئیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں۔

حضرت عباسؓ کی ایک آواز بجلی کی طرح دوڑ گئی، اور یکایک سب بھاگنے والوں کو پشیمانی ہوئی، اور بڑی دلیری کے ساتھ لوٹ کر دشمن کا پورا مقابلہ کیا، اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد بھیج دی، ان کا کمانڈر مالک بن عوف اپنے اہل وعیال اور سب مال کو چھوڑ کر بھاگا، اور طائف کے قلعہ میں جا چھپا، اور پھر باقی پوری قوم بھاگ کھڑی ہوئی، ان کے ستر سردار مارے گئے، بعض مسلمانوں کے ہاتھ سے کچھ بچے زخمی ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی سے منع فرمایا، ان کا سب مال مسلمانوں کے قبضہ میں آیا، چھ ہزار جنگی قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چار ہزار اوقیہ چاندی ہاتھ آئی۔

پہلی اور دوسری آیت میں اسی مضمون کا بیان ہے، ارشاد فرمایا کہ جب تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ ہو گیا تھا پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور زمین باوجود فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تسلی نازل فرمائی اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اور ایسے لشکر فرشتوں کے نازل کر دیئے، جن کو تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو تمہارے ہاتھ سے سزا دلوادی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ "یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر اور سب مسلمانوں پر اپنی تسلی نازل فرمادی"

معنی اس کے یہ ہیں کہ غزوۂ حنین کے ابتدائی حملہ میں جن صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب پر اپنی تسلی نازل فرمادی، جس سے ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے، اور بھاگنے والے پھر لوٹ آئے، اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان صحابہ پر جو مضبوطی کے ساتھ محاذ پر جمے رہے تسلی نازل فرمانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی فتح قریب نظر آنے لگی، اور چونکہ تسلی کی یہ دو قسمیں تھیں ایک بھاگنے والوں کے لئے دوسری رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمے رہنے والوں کے لئے، اسی طرف اشارہ کرنے کے لئے عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کو علیحدہ علیحدہ تکرار عَلٰی کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا، یعنی ایسے لشکر نازل فرمادیئے جن کو تم نے نہیں دیکھا، اس سے مراد عام طور پر لوگوں کا نہ دیکھنا ہے، احاد وافراد سے جو بعض روایتوں میں اس لشکر کا دیکھنا منقول ہو وہ اس کے منافی نہیں۔

پھر فرمایا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ "یعنی کافروں کو اللہ تعالیٰ نے سزا دیدی اور کافروں کی یہی سزا ہے" اس سزا سے مراد ان کا مسلمانوں کے ہاتھوں مفتوح اور مغلوب ہونا ہے، جو واضح طور پر مشاہدہ میں آیا، مطلب یہ ہے کہ یہ دنیاوی سزا تھی، جو فوری طور پر مل گئی،

آگے آخرت کے معاملہ کا ذکر بعد کی آیت میں اس طرح آیا ہے:

ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ "یعنی پھر خدا تعالیٰ جسکو چاہیں توبہ نصیب کر دیں، اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنیوالے ہیں"

اس میں اشارہ ہے کہ اس جہاد میں جن لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں مغلوب اور مفتوح ہونیکی سزا مل چکی ہے، اور ابھی تک وہ اپنے کفر پر قائم ہیں، ان میں سے بھی کچھ لوگوں کو توفیق ایمان نصیب ہوگی، چنانچہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل یہ ہے:

حنین کی فتح، اور ہوازن وثقیف کے سرداروں کا مسلمان ہو کر حاضر ہونا قیدیوں کی واپسی

حنین میں قبیلہ ہوازن وثقیف کے کچھ سردار مارے گئے، کچھ بھاگ کھڑے ہوئے ان کے ساتھ جو ان کے اہل وعیال اور اموال تھے وہ مسلمانوں کے قیدی اور مالِ غنیمت بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئے جس میں چھ ہزار قیدی چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار سے زائد بکریاں، اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی، جس کے تقریباً چار من ہوتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوسفیان بن حرب کو اموالِ غنیمت کا نگران مقرر فرمایا۔

پھر شکست خوردہ ہوازن اور ثقیف نے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے خلاف اجتماع کیا مگر ہر مقام پر ان کو شکست ہوتی گئی، وہ سخت مرعوب ہو کر طائف کے نہایت مستحکم قلعہ میں قلعہ بند ہو گئے، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ بیس روز اس قلعہ کا محاصرہ کیا، یہ قلعہ بند دشمن اندر ہی سے تیر برساتے رہے، سامنے آنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی، صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان لوگوں کے لئے بددعاء فرمایئے، مگر آپ نے ان کے لئے ہدایت کی دعاء فرمائی اور بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ فرما کر واپسی کا قصد فرمایا، اور مقام جعرانہ پر پہونچ کر ارادہ فرمایا کہ پہلے مکہ معظمہ جا کر عمرہ ادا کریں، پھر مدینہ طیبہ کو واپسی ہو، مکہ والوں کی بڑی تعداد جو تماشائی بن کر مسلمانوں کی فتح وشکست کا امتحان کرنے آئی تھی، اس جگہ پہونچ کر ان میں سے بہت لوگوں نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

اسی مقام پر پہونچ کر مالِ غنیمت کی تقسیم کا انتظام کیا گیا تھا، ابھی اموالِ غنیمت تقسیم ہو ہی رہے تھے، کہ دفعۃً ہوازن کے چودہ سرداروں کا ایک وفد زہیر بن صرد کی قیادت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، . . . . . .

. . . جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا ابوبرقان بھی تھے، انھوں نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم مسلمان ہو چکے ہیں، اور یہ درخواست کی کہ ہمارے اہل وعیال اور اموال ہمیں واپس دیدیئے جائیں، اس درخواست میں عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ہم بسلسلۂ رضاعت آپ کے

خویش و عزیز ہیں، اور جو مصیبت ہم پر پڑی ہے وہ آپ سے مخفی نہیں، آپ ہم پر احسان فرمائیں، رئیسِ وفد ایک شاعر آدمی تھا، اس نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر ہم بادشاہِ روم یا شاہِ عراق سے اپنی ایسی مصیبت کے پیشِ نظر کوئی درخواست کرتے تو ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ بھی ہماری درخواست کو رد نہ کرتے اور آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے اخلاقِ فاضلہ میں سب سے زیادہ ممتاز فرمایا ہے، آپ سے ہم بڑی امید لے کر آئے ہیں۔

رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ موقع دوہری مشکل کا تھا، کہ ایک طرف ان لوگوں پر رحم وکرم کا تقاضا یہ کہ ان کے سب قیدی اور اموال ان کو واپس کر دیئے جائیں، دوسری طرف یہ کہ اموالِ غنیمت میں تمام مجاہدین کا حق ہوتا ہے، ان سب کو ان کے حق سے محروم کر دینا از روئے انصاف درست نہیں، اس لئے صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جواب میں فرمایا:

میرے ساتھ کس قدر مسلمانوں کا لشکر ہے، جو اِن اموال کے حق دار ہیں، میں سچی اور صاف بات کو پسند کرتا ہوں، اس لئے آپ لوگوں کو اختیار دیتا ہوں کہ یا تو اپنے قیدی واپس لے لو یا اموالِ غنیمت ان دونوں میں جس کو تم انتخاب کرو وہ تمہیں دیدیئے جائیں گے، سب نے قیدیوں کی واپسی کو اختیار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا جس میں حمد وثناء کے بعد فرمایا کہ:

> "یہ تمہارے بھائی تائب ہو کر آگئے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی ان کو واپس دیدیئے جائیں، تم میں سے جو لوگ خوش دلی کے ساتھ اپنا حصہ واپس دینے کے لئے تیار ہوں وہ احسان کریں اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں تو ہم ان کو آئندہ اموالِ فئے میں سے اس کا بدلہ دیدیں گے"۔

حقوق کے معاملہ میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے عوامی جلسوں کی آوازیں کافی نہیں، ہر ایک سے علیحدہ رائے معلوم کرنا چاہئے

مختلف اطراف سے یہ آواز اٹھی کہ ہم خوش دلی کے ساتھ سب قیدی واپس کرنے کے لئے تیار ہیں، مگر عدل وانصاف اور حقوق کے معاملہ میں احتیاط کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی مختلف آوازوں کو کافی نہ سمجھا، اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ کون لوگ اپنا حق چھوڑنے کے لئے خوش دلی سے تیار ہوئے اور کون ایسے ہیں جو شرما شرمی خاموش رہے، معاملہ لوگوں کے حقوق کا ہے اس لئے ایسا کیا جائے کہ ہر جماعت اور خاندان کے سردار اپنی اپنی جماعت کے لوگوں سے الگ الگ صحیح بات معلوم کر کے مجھے بتائیں۔

اس کے مطابق سرداروں نے ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ اجازت حاصل کرنے کے بعد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ سب لوگ خوش دلی سے اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار ہیں، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب قیدی ان کو واپس کر دیئے۔

یہی وہ لوگ تھے جن کے تائب ہونے کی طرف مذکورہ تیسری آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ الآیۃ، غزوۂ حنین میں پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس کا کچھ حصہ تو خود قرآن کریم میں مذکور ہے اور باقی مستند روایاتِ حدیث سے لیا گیا ہے (مظہری وابن کثیر)

احکام ومسائل

ان واقعات کے ضمن میں بہت سے احکام وہدایات اور ضمنی فوائد آئے ہیں، وہی ان واقعات کے بیان کرنے کا اصل مقصد ہیں۔

آیاتِ مذکورہ میں سب سے پہلی ہدایت تو یہ دی گئی کہ مسلمانوں کو کسی وقت بھی اپنی جمعیت اور طاقت پر غرّہ نہ ہونا چاہئے، جس طرح کمزوری اور بے سامانی کے وقت ان کی نظر اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد پر رہتی ہے اسی طرح قوت وطاقت کے وقت بھی ان کا مکمل اعتماد صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی پر ہونا چاہئے۔

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کی تعداد کی کثرت اور سامانِ حرب کے کافی ہونے کی وجہ سے بعض صحابۂ کرام کی زبان پر جو یہ بڑا بول آگیا تھا کہ آج تو کسی کی مجال نہیں جو ہم سے بازی لیجا سکے، اللہ تعالیٰ کو اپنی اس محبوب جماعت کی زبان سے ایسے کلمات پسند نہ آئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی حملہ کے وقت مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اور بھاگنے لگے، پھر اللہ تعالیٰ ہی کی غیبی امداد سے یہ میدان فتح ہوا۔

مفتوح ومغلوب کفار کے اموال میں عدل وانصاف اور احتیاط

دوسری ہدایت اس واقعہ سے یہ حاصل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے لئے مکہ کے مفتوح غیر مسلموں سے جو سامانِ جنگ زرہیں اور نیزے لئے تھے یہ ایسا موقع تھا کہ ان سے زبردستی بھی یہ چیزیں لی جا سکتی تھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاریت کہہ کر لیا اور پھر سب کو ان کی مستعار چیزیں واپس کر دیں۔

اس واقعہ نے مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ بھی پورے عدل وانصاف اور رحم وکرم کے معاملہ کا سبق دیا۔

تیسری ہدایت اس ارشادِ نبوی سے حاصل ہوئی جس میں حنین کی طرف جاتے ہوئے خیف بنی کنانہ میں قیام کے وقت فرمایا کہ کل ہم ایسے مقام پر قیام کریں گے جس میں بیٹھ کر ہمارے دشمن قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف مقاطعہ کی قرارداد پر معاہدہ کیا تھا، اس میں

اشارہ ہو کہ جب مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے فتح و قوت عطا فرما دی تو اپنے پچھلے مصیبت کے دور کو نہ بھلا دیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہو سکے، ہوازن کے شکست خوردہ لوگوں کے بار بار حملہ آور ہونے اور تیر برسانے کے جواب میں رحمۃ للعالمین کی زبانِ مبارک سے بددعا کے بجائے ان کے لئے ہدایت کی دعا مسلمانوں کو یہ سبق دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی جنگ و جہاد کا مقصد صرف دشمن کو زیر کرنا نہیں، بلکہ ان کو ہدایت پر لانا ہے، اس لئے اس کی کوشش سے کسی وقت غفلت نہ ہونی چاہئے۔

تیسری آیت نے یہ ہدایت کر دی کہ جو کفار مقابلہ میں مغلوب ہو جائیں ان سے بھی مایوس نہ ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو پھر اسلام و ایمان کی ہدایت دیدیں، جیسا کہ وفد ہوازن کے واقعہ اسلام سے ثابت ہوا۔

وفد ہوازن کی درخواست پر ان کے جنگی قیدیوں کی واپسی کے وقت جب صحابہ کرام کے مجمع سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا اور مجمع کی طرف سے یہ آوازیں آئیں کہ ہم سب انکی واپسی کیلئے خوشدلی سے رضامند ہیں، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کافی نہ سمجھا بلکہ جدا جدا ہر ایک کی اجازت معلوم کرنے کا اہتمام فرمایا۔

اس سے ثابت ہوا کہ حقوق کے معاملہ میں جب تک خوش دلی کا اطمینان نہ ہو جائے کسی کا حق لینا جائز نہیں، مجمع کے رُعب یا لوگوں کی شرم سے کسی کا خاموش رہنا رضامندی کے لئے کافی نہیں، اسی سے حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص پر اپنی وجاہت کا رعب ڈال کر کسی دینی مقصد کے لئے چندہ کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ ایسے حالات میں بہت سے شریف آدمی محض شرما شرمی کچھ دیدیتے ہیں، پوری رضامندی نہیں ہوتی، اس طرح کے مال میں برکت بھی نہیں ہوتی ۰

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّمَا ٱلْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُواْ

اے ایمان والو مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پاویں

ٱلْمَسْجِدَ ٱلْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً

مسجد الحرام کے اس برس کے بعد اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے

فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦٓ إِن شَآءَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

تو آئندہ غنی کر دیگا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصۂ تفسیر

اے ایمان والو مشرک لوگ (بوجہ عقائد خبیثہ کے) نرے ناپاک ہیں سو (اس ناپاکی پر جو احکام متفرع ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہو کر) یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی حرم) کے پاس (بھی) نہ آنے پاویں (یعنی حرم کے اندر داخل نہ ہوں) اور اگر تم کو (اس حکم کے جاری کرنے سے بدیں وجہ) مفلسی کا اندیشہ ہو (کہ لین دین انہی سے زیادہ متعلق ہے جب یہ نہ رہیں گے تو کام کیسے چلے گا) تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا (ان کا) محتاج نہ رکھے گا، بیشک اللہ تعالیٰ (احکام کی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا ہے (اور ان مصلحتوں کی تکمیل کے باب میں) بڑا حکمت والا ہے (اس لئے یہ حکم مقرر کیا اور تمہارے افلاس کے انسداد کا سامان بھی کر دے گا) ۰

معارف ومسائل

سورۂ توبہ کے شروع میں کفار و مشرکین سے اعلانِ برارت کیا گیا تھا، مذکور الصدر آیت میں اس اعلانِ برارت سے متعلقہ احکام کا ذکر ہے، اعلانِ برارت کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کفار کے معاہدات ختم یا پورے کر دیئے جائیں، اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حدودِ حرم میں نہ رہنے پائے۔

اس آیت میں اسی کا بیان ایک خاص انداز میں..... کیا گیا ہے، جس میں اس حکم کی حکمت و مصلحت بھی بتلا دی اور اس کی تعمیل میں جو بعض مسلمانوں کو خطرات تھے ان کا بھی جواب دیدیا، اس میں لفظ نَجَسٌ بفتح جیم استعمال فرمایا ہے، جو نجاست کے معنی میں ہے، اور نجاست کہا جاتا ہے ہر گندگی کو جس سے انسان کی طبیعت نفرت کرے، امام راغب اصفہانیؒ نے فرمایا کہ اس میں وہ نجاست بھی داخل ہے جو آنکھ، ناک یا ہاتھ وغیرہ سے محسوس ہو، اور وہ بھی جو علم و عقل کے ذریعہ معلوم ہو، اس لئے لفظ نجس اس غلاظت اور گندگی کو بھی شامل ہے جو ظاہری طور پر سب محسوس کرتے ہیں، اور اس معنوی نجاست کو بھی جس کی بناء پر شرعاً وضو یا غسل واجب ہوتا ہے، جیسے جنابت یا حیض و نفاس کے ختم ہونے کے بعد کی حالت، اور وہ باطنی نجاست بھی جس کا تعلق انسان کے قلب سے ہے، جیسے عقائد فاسدہ اور اخلاق رذیلہ۔

آیت مذکورہ میں کلمۂ اِنَّمَا لایا گیا ہے جو حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ کے معنی یہ ہوگئے کہ مشرکین نری نجاست ہی ہیں، اور صحیح بات یہ ہے کہ عام طور پر مشرکین میں تینوں قسم کی نجاستیں ہوتی ہیں، کیونکہ بہت سی ظاہری ناپاک چیزوں

کو وہ ناپاک نہیں سمجھتے، اس لئے ان ظاہری نجاستوں سے بھی نہیں بچتے جیسے شراب اور اس سے بنی ہوئی چیزیں، اور معنوی نجاست سے غسلِ جنابت وغیرہ کے تو وہ معتقد ہی نہیں، اسی طرح عقائدِ فاسدہ اور اخلاق رذیلہ کو بھی وہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اسی لئے آیت مذکورہ میں مشرکین کو نری نجاست قرار دے کر یہ حکم دیا گیا فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا، یعنی ایسا کرنا چاہئے کہ اس سال کے بعد یہ مشرکین مسجد حرام کے پاس نہ جاسکیں"

مسجد حرام کا لفظ عام طور پر تو اس جگہ کے لئے بولا جاتا ہے جو بیت اللہ کے گرد ..... چار دیواری سے گھری ہوئی ہے، لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے، جو کئی میل مربع کا رقبہ اور چاروں طرف حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے، جیسا کہ واقعۂ معراج میں مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے باتفاق یہی معنی مراد لئے گئے ہیں، کیونکہ واقعۂ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت اُمّ ہانی رضؓ کے مکان سے ہوا ہے، اسی طرح آیت کریمہ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ میں مسجد حرام سے پورا حرم ہی مراد ہے، کیونکہ جس واقعۂ صلح کا اس میں ذکر ہے، وہ مقام حدیبیہ پر ہوا ہے، جو حدودِ حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔ (جصاص)

اس لئے معنے آیت کے یہ ہو گئے کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدودِ حرم میں ممنوع ہے، اس سال سے مراد کونسا سال ہے، بعض حضرات نے فرمایا کہ سنہ ہجری مراد ہے، مگر جمہور مفسرین کے نزدیک سنہ ۹ ہجری راجح ہے، کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ برأت حضرت صدیق اکبر رضؓ اور علی مرتضیٰ رضؓ کے ذریعہ موسم حج میں اسی سنہ ۹ ھ میں کرایا ہے، اس لئے سنہ ۹ ھ سے سنہ ۱۰ ھ تک مہلت کا سال ہے، سنہ ہجری کے بعد یہ قانون نافذ ہوا۔

مشرکین کے مسجد حرام میں داخلے کی ممانعت کا مطلب اور یہ کہ مسجدِ حرام کی خصوصیت ہے یا سب مسجدوں کے لئے عام ہے

آیت مذکورہ میں جو حکم دیا گیا ہے کہ سنہ ۱۰ ھ کے بعد سے کوئی مشرک مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائے اس کے متعلق تین باتیں غور طلب ہیں، کہ یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے یا دنیا کی دوسری مسجدیں بھی اسی حکم میں داخل ہیں اور اگر مسجد حرام کے ساتھ مخصوص ہے تو کسی مشرک کا داخلہ مسجد حرام میں مطلقاً ممنوع ہے، یا صرف حج وعمرہ کیلئے داخلہ کی ممانعت ہے، دوسرے یہ کہ آیت میں یہ حکم مشرکین کا بیان کیا گیا ہے، کفار اہلِ کتاب بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں۔

ان تفصیلات کے متعلق چونکہ الفاظ قرآن ساکت ہیں اس لئے اشاراتِ قرآن اور

روایاتِ حدیث کو سامنے رکھ کر ائمہ مجتہدین نے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق احکام بیان فرمائے، اس سلسلہ میں پہلی بحث اس میں ہے کہ قرآن کریم نے مشرکین کو نجس کس اعتبار سے قرار دیا ہے، اگر ظاہری نجاست یا معنوی جنابت وغیرہ مراد ہے تو ظاہر ہے کہ کسی مسجد میں نجاست کا داخل کرنا جائز نہیں، اسی طرح جنابت والے شخص یا حیض ونفاس والی عورت کا داخلہ کسی مسجد میں جائز نہیں، اور اگر اس میں نجاست سے مراد کفر وشرک کی باطنی نجاست ہی تو ممکن ہے کہ اس کا حکم ظاہری نجاست سے مختلف ہو۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ فقہائے مدینہ امام مالک وغیرہ رحمہم اللہ نے فرمایا کہ مشرکین ہر معنی کے اعتبار سے نجس ہیں، ظاہری نجاست سے بھی عموماً اجتناب نہیں کرتے، اور جنابت وغیرہ کے بعد غسل کا بھی اہتمام نہیں کرتے، اور کفر وشرک کی باطنی نجاست تو ان میں ہے ہی، اس لئے یہ حکم تمام مشرکین اور تمام مساجد کے لئے عام ہے، اور اس کی دلیل میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ فرمان پیش کیا جس میں انھوں نے امراء بلاد کو ہدایت کی تھی کہ کفار کو مساجد میں داخل نہ ہونے دیں، اس فرمان میں اسی آیتِ مذکورہ کو تحریر فرمایا تھا:

نیز یہ کہ حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لَا أُحِلُّ الْمَسْجِدَ لِحَائِضٍ وَّ لَا جُنُبٍ،	"یعنی مسجد میں داخل ہونا کسی حائضہ عورت یا جنبی شخص کیلئے میں حلال نہیں سمجھتا"

اور مشرکین وکفار عموماً حالتِ جنابت میں غسل کا اہتمام نہیں کرتے، اس لئے ان کا داخلہ مساجد میں ممنوع ہے۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ حکم مشرکین اور کفار اہلِ کتاب سب کے لئے عام ہے، مگر مسجد حرام کے لئے مخصوص ہے، دوسری مساجد میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں، (قرطبی) اور دلیل میں ثمامہ ابن اُثال کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے پہلے یہ گرفتار ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ دیا تھا۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک آیت میں مشرکین کو مسجدِ حرام کے قریب جانے سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ سال سے ان کو مشرکانہ طرز پر حج وعمرہ کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اور دلیل یہ ہے کہ جس وقت موسم حج میں حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کے ذریعہ اعلانِ برأت کردیا گیا تو اس میں اعلان اسی کا تھا کہ لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، جس میں ظاہر کردیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرسکے گا، اس لئے اس آیت میں فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ کے معنی بھی اس اعلان کے مطابق یہی ہیں کہ ان کو حج وعمرہ کی ممانعت کردی گئی،

اور کسی ضرورت سے باجازت امیر المؤمنین داخل ہو سکتے ہیں، وفد ثقیف کا واقعہ اس کا شاہد ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا حالانکہ یہ لوگ اس وقت کافر تھے، صحابہ کرام نے عرض بھی کیا، یا رسول اللہ یہ نجس قوم ہے، تو آپ نے فرمایا کہ مسجد کی زمین پر ان لوگوں کی نجاست کا کوئی اثر نہیں پڑتا (جصاص)

اس روایت نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ قرآن کریم میں مشرکین کو نجس کہنے سے انکی نجاستِ کفر و شرک مراد ہے، جیسا کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، اسی طرح حضرت جابر ابن عبداللہؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی مشرک مسجد کے پاس نہ جائے، بجز اس کے کہ وہ کسی مسلمان کا غلام یا کنیز ہو تو بضرورت اس کو داخل کر سکتے ہیں (قرطبی)

یہ حدیث بھی اسی کی شاہد ہے کہ نجاست ظاہری کو سبب قرار دے کر مشرکین کو مسجد حرام سے نہیں روکا گیا ورنہ اس میں غلام اور جاریہ کی کوئی تخصیص نہ تھی، بلکہ بنیاد اصل کفر و شرک اور ان کے غلبہ کا خطرہ ہے، غلام و کنیز میں یہ خطرہ نہیں، ان کو اجازت دیدی گئی، اس کے علاوہ ظاہری نجاست کے اعتبار سے تو مسلمان بھی اس میں داخل ہیں کہ نجاست یا حدث اکبر کی حالت میں ان کے لئے بھی مسجد حرام کا داخلہ ممنوع ہے۔

نیز جمہور کی تفسیر کے مطابق مسجد حرام سے اس جگہ جب پورا حرم مراد ہے تو وہ بھی اسی کا مقتضی ہے کہ یہ ممانعت ظاہری نجاست کی بنیاد پر نہیں، بلکہ کفر و شرک کی نجاست کی بناء پر ہے، اسی لئے صرف مسجد حرام میں ان کا داخلہ ممنوع نہیں کیا گیا، بلکہ پورے حرم محترم میں ممنوع قرار دیا گیا، کیونکہ وہ اسلام کا حمی اور ایک قلعہ ہے، اس میں کسی غیر مسلم کو رکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

امام اعظم ابو حنیفہؒ کی اس تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ اگرچہ نجاسات سے مساجد کی تطہیر بھی ایک مستقل مسئلہ ہے، جو قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے، لیکن اس آیت کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں بلکہ اسلام کے اس سیاسی حکم سے ہے جس کا اعلان سورۂ برأت کے شروع میں کیا گیا ہے، کہ جتنے مشرکین مکہ میں موجود تھے، ان سب کے حرم محترم کو خالی کرانا مقصود تھا، لیکن بتقاضائے عدل و انصاف و رحم و کرم مکہ فتح ہوتے ہی سب کو یک قلم خارج کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ جن لوگوں سے کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا اور وہ لوگ اس معاہدہ پر قائم رہے تو ان کی میعاد معاہدہ پوری کر کے اور باقیوں کو کچھ کچھ مہلت دے کر سال بھر کے اندر اس تجویز کی تکمیل پیش نظر تھی، اسی کا بیان اس آیت مذکورہ میں آیا کہ اس سال کے بعد مشرکین کا داخلہ حدودِ حرم میں ممنوع ہو جائیگا وہ مشرکانہ حج و عمرہ نہ کرنے پائیں گے۔

اور جس طرح سورۂ توبہ کی آیات میں واضح طور پر یہ بیان کر دیا گیا ہے کہ ۹ھ ہجری کے بعد

کوئی مشرک حدودِ حرم میں داخل نہ ہو سکے گا، روایات حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کو اور وسیع فرما کر پورے جزیرۃ العرب کے لئے بھی حکم دیدیا تھا، مگر عہد رسالتؐ میں اس کی تکمیل نہ ہونے پائی، پھر صدیق اکبرؓ بھی دوسرے ہنگامی مسائل کی وجہ سے اس پر توجہ نہ دے سکے فاروق اعظمؓ نے اپنے زمانہ میں اس حکم کو نافذ فرمایا۔

اب رہا کفار کی نجاست اور مساجد کی نجاسات سے تطہیر کا مسئلہ وہ اپنی جگہ ہے جس کے مسائل کتب فقہ میں تفصیل سے مذکور ہیں، کوئی مسلمان بھی ظاہری نجاست یا حالتِ جنابت میں کسی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا، اور عام کفار و مشرکین ہوں یا اہل کتاب وہ بھی عموماً ان نجاسات سے پاک نہیں ہوتے، اس لئے بلا ضرورت شدیدہ ان کا داخلہ بھی کسی مسجد میں جائز نہیں۔

اس آیت کی رُو سے جب کفار و مشرکین کا داخلہ حرم میں ممنوع کر دیا گیا تو مسلمانوں کے سامنے ایک معاشی مسئلہ یہ پیش آیا کہ مکہ میں کوئی پیداوار نہیں، باہر کے آنے والے ہی اپنے ساتھ ضروریات لاتے تھے، اور موسم حج میں اہل مکہ کے لئے سب ضروریات جمع ہو جاتی تھیں، اب ان کا داخلہ ممنوع ہو جانے کے بعد کام کیسے چلے گا، اس کا جواب قرآن میں یہ دیا گیا کہ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ، "یعنی اگر تمہیں معاشی مشکلات کا اندیشہ ہو تو سمجھ لو کہ نظامِ معاش تمام مخلوق کا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے، اگر وہ چاہیں گے تو تمہیں ان سب کفار سے مستغنی کر دیں گے، اور یہاں "اگر چاہیں گے" کی قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں کوئی شک و تردد ہے، بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت بعید اور مشکل نظر آتی ہے کہ ظاہری ذریعہ معاش یہی غیر مسلم تھے، ان کا داخلہ ممنوع کرنا اپنے لئے اسبابِ معاش منقطع کرنے کے مترادف ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جائے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں، اس لئے اِنْ شَآءَ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا

لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ

يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ

حرام جانتے ہیں اس کو جسکو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا